منیر احمد/یوسف نون

شہاب دہلوی کی مرثیہ گوئی

Shahab Dehlvi's obituary

Abstract:

Shahab Dehlavi is a unique eulogist/elegy writer. Sitting far from the center in Bahawalpur division, he not only wrote the elegy, but his elegies decorated with all the elements of elegy, is a great addition to the tradition of eulogy/elegy. His elegies not only have deep affinity with Ahl-e- Bayt-e-Athar, but they also contain a strong, unique and positive message.

Key Words: Bahawalpur, elegy, Masood Hassan Shahab Dehlvi, Anees, Dabeer, Nafees Fatehpuri, Agha Sikandar Mehdi, Waheed Qureshi, Ehsan Danish, Majid Qureshi.

مرثیہ اردو شاعری کی ایسی صنفِ ادب ہے جس میں تقریباً سبھی اصنافِ سخن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مرثیہ لفظ "رثا" سے مشتق ہے جس کے معنی "مردے کو رونا"، جی کڑانا ہے۔ اصطلاح میں مرثیہ ایسی صنف سخن ہے جس میں کسی کو ایسے یاد کرنا کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ کیا ہی عظیم شخص تھا جو مرا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بقول:۔

> "مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہداء کے شہید ہونے پر ہوتا ہے۔"(۱)

مرثیے کی بے شمار تعریفیں موجود ہیں اور مرثیہ کی عربی، فارسی اور اردو روایت بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

شہاب احمد دہلوی کا اصل نام سید مسعود حسن رضوی تھا۔ وہ دہلی کے ایک علمی خانوادے میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔(۲) شہاب دہلوی نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ماہ نامہ ''الہام'' کے اجراء سے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد دہلی چھوڑ کر بہاول پور اپنے ننھیالی خاندان میں آ گئے۔ ان کا یہ خاندان ریاست میں علمی و ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں سرگرم تھا۔

سید شہاب دہلوی نے بہاول پور آ کر ''الہام'' کو دوبارہ جاری کیا۔ ان کی ادبی کاوشوں میں ''مشاہیر بہاول''، ''اولیائے بہاول پور''، ''خواجہ غلام فرید حیات و شاعری''، ''بہاول پور میں اردو''، ''خطہ پاک اوچ شریف''، اور ''وادیٔ جمنا سے وادیٔ ہاکڑہ تک''، اور شاعری میں ''نقوش شہاب''، ''گل و سنگ'' اور ''موجِ نور'' شامل ہیں۔

"موجِ نور" میں سلام، منقبت اور مرثیہ شامل ہے۔ شہاب دہلوی ۲۹ اگست ۱۹۹۰ء میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا درمیانی وقفہ جو کم و بیش دو دہائیوں پر مشتمل ہے، برصغیر کی تاریخ میں نہ صرف سماجی، سیاسی اور معاشی، مدوجزر کا ایک مخصوص نقشہ پیش کرتا ہے بلکہ تہذیب و ثقافت اور شعر و ادب کے شعبوں میں بھی ارتقاء پذیر رجحانات کی ہمہ گیری کے باعث خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ شہاب دہلوی کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے، تجزیہ کرنے اور ان کے مخصوص رجحانات کا تعین کرنے میں اس لئے بھی مدد مل سکتی ہے کہ شہاب کی ولادت ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ہوئی(۳) اور یہ وہی دور ہے جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی وقفہ پر محیط ہے۔ قطع نظر اس کے کہ جب شہابؔ نے آنکھیں کھولیں اور سنِ شعور کو پہنچے تو دہلی کی فضاء اس وقت اردو غزل کی ضیاء باریوں سے منور تھی۔ وہ خود بھی ایسے خانوادے میں پیدا ہوئے جو علمی، ادبی اور مذہبی روایات کا امین تھا۔ ان کے والد سید منظور حسین رضوی ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ تصنیف و تالیف ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ سید میر حسن رضوی جو شہابؔ دہلوی کے دادا تھے صرف ادیب ہی نہیں بلکہ مقتدر صحافی بھی تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۱ء میں ''خیر خواہ عالم'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ شہابؔ دہلوی کے والد نے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں ''جمال خسروی''، ''مصباح العاشقین'' اور ''حیات اولین'' قابل ذکر ہیں۔ خاندان کی اس بھرپور علمی و ادبی فضاء میں ان کے تایا سید محمود الحسن ایک مخصوص مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ اثرؔ تخلص کرتے تھے اور ان کے عہد میں انہیں ایک قادر الکلام شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔

شہاب دہلوی کے اس خاندانی پس منظر کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ نسبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ شعر و ادب کے حوالے سے بھی وہ نجیب الطرفین تھے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ صرف ددھیال ہی سے نہیں بلکہ ننھیال سے بھی انہیں فکرِ شعر ورثے میں ملی تھی۔ ان کے نانا میر افضل حسن غزل اور مرثیہ کہنے میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے مرثیہ اور غزلوں کے دو ضخیم مجموعے چھوڑے ہیں۔ چنانچہ خاندانی ماحول کی اثر پذیری شہاب دہلوی کی شخصیت میں شروع سے نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی نگارشات کی ابتداء بچوں کی نظمیں لکھ کر کی۔ وہ جو کچھ لکھتے اپنے والد کو دکھا لیتے تھے جو بڑی محبت سے ان کے کلام کی اصلاح کرتے۔

ماحول اور شخصیت کا فیضان شہابؔ دہلوی کی زندگی میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اپنی شخصیت کی نشوونما اور تعمیر ان بزرگوں کا ذہنی و فکری اور روحانی ورثہ ہے۔ جن کی سرپرستی یا قربت انہیں اپنے خاندان میں اور خاندان سے باہر دہلی کی مجلسی زندگی

میں میسر آئی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں دہلی جلیل المرتبت شعراء کا مرکز و مسکن بن گیا تھا جس میں پنڈت ناتھ ساحرؔ، سید وحید الدین بیخودؔ دہلوی، نواب سراج الدین سائلؔ جو نواب مرزا داغؔ کے داماد بھی تھے اور دیگر ہم عصر شعراء شامل ہیں۔

شہابؔ دہلوی کو ان قد آور شخصیتوں کا فیضان صحبت حاصل رہا۔ لیکن جس شخصیت نے غزل کے حوالے سے ان کی ذہنی اور فکری راہیں متعین کیں وہ حیدرؔ دہلوی تھے جن کی غزل اور رباعی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ رباعی میں ان کی قادرالکلامی اور مخصوص رنگِ کلام کے باعث انہیں ''خیام الہند'' کے لقب سے بھی نوازا گیا۔ شہابؔ کا تعلق دہلی کے اس مکتب شاعری سے استوار ہوتا گیا جس کی بنیاد شاہ حاتم نے رکھی تھی۔ یہ بات اس لئے بھی قرین صداقت ہے کہ ان کے رنگ کلام میں دہلی کا مخصوص لب ولہجہ ہی نہیں بلکہ فکر کا تسلسل بھی ملتا ہے۔ جو داغؔ اور امیرؔ مینائی کے تلامذہ کا طرۂ امتیاز تھا۔

شہاب دہلوی کے ابتدائی دور کا جائزہ لینے سے یہ بات بالخصوص سامنے آتی ہے کہ انہوں نے صرف متنوع موضوعات پر ہی شاعری نہیں کی بلکہ اسے ایک اعلیٰ وارفع فن کے طور پر اپنایا۔ اس بات کا ثبوت ان کی تقسیم ملک سے قبل کی ان تحریروں سے ملتا ہے جن کے ذریعے انہوں نے فن شعر کے مختلف پہلوؤں پر خود اپنے جریدے ''الہام'' میں اظہار خیال کیا۔ شہابؔ دہلوی نے ۱۹۴۰ء میں ''الہام'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جو ان کی کاوش وصلاحیت کے باعث بہت جلد مقبول جرائد میں شمار ہونے لگا۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد شہابؔ دہلوی نے ''الہام'' کا ایک ہفتہ وار ایڈیشن بھی نکالنا شروع کر دیا اور اس طرح ماہنامہ کو خالص علمی و ادبی مضامین کے لئے مخصوص رکھا۔ ہفتہ وار ایڈیشن میں سیاسی مضامین شامل کئے گئے۔ اس دور میں شعر اور فن پر جو بڑی بڑی بحثیں علمی و ادبی جرائد میں اشاعت پذیر ہوئیں ان میں شہابؔ دہلوی نے بھی بھرپور حصہ لیا اور اپنی ناقدانہ اور علمی حیثیت کو منوایا۔

شہابؔ دہلوی کا شمار برصغیر پاک وہند کے مقتدر، منفرد اور صاحب فن شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''گل وسنگ'' اس بات کا مظہر ہے کہ انہوں نے تخلیق شعر میں بڑی ریاضت کی ہے۔ اس ریاضت فن کا بڑے بڑے ناقدین نے اعتراف بھی کیا ہے اور ان کے تخلیقی اظہار کی بہت تعریف کی ہے بقول احسان دانشؔ۔

''شہابؔ دہلوی صاحب طرز لوگوں میں سے ہیں۔''(۴)

راقم الحروف کے نزدیک یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہی یونہی کہی جاسکتی ہے۔ خود شہابؔ دہلوی نے بھی اس جانب اپنے مجموعہ ''گل وسنگ'' کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔

''زیر نظر مجموعہ میرے گذشتہ بیس سالہ افکار و خیالات کا حاصل ہے۔ اس
عرصے میں سیاسی و سماجی حالات نے جس طرح کروٹیں لی ہیں ان کا عکس اس مجموعے میں
نظر آئے گا۔''(۵)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ''گل وسنگ'' میں ہمیں لمحہ موجودہ اور روح عصر بولتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں شہابؔ دہلوی اپنے اردگرد کی تبدیلیوں اور سماجی عوامل سے بے خبر نہیں رہے اور ان معاملات سے متعلق ان کے ہاں بلیغ اشارے ملتے ہیں۔

بہاول پور وہ تاریخی خطہ ہے جو ہمیشہ علوم و فنون کا مرکز، معرفت و روحانیت کی آماجگاہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ بہاول پور میں سید مسعود حسن شہاب دہلوی کی آمد و سکونت سے وہاں علمی و ادبی اور صحافتی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا جو ان کی وفات پر اختتام کو پہنچا۔

شہابؔ دہلوی عظیم المرتبت مورخ، محقق، مصنف، مولف، ادیب، صحافی، شاعر، سماجی کارکن کے علاوہ بہت سی تنظیموں کے بانی عہدیدار، منتظم، نگران اور روح رواں تھے۔ اردو کی ترویج و ترقی نشر و اشاعت ان کی متحرک و فعال زندگی کا نصب العین تھا۔ انہوں نے جس لگن، انہماک، شب و روز کی محنت، تگ و دو سے دیارِ بہاول پور میں گلستانِ اردو کی آبیاری، نگہبانی کی اس چمن میں گلہائے رنگا رنگ کھلائے ان کی خوشبوؤں سے نہ صرف وادی ہاکڑہ بلکہ خیبر بھی مہک رہی ہے اس لحاظ سے ''بابائے اردو بہاول پور'' کہلانے کے مستحق ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شہابؔ نے اپنی تحریر میں جو زبان استعمال کی ہے وہ ان کے دہلوی ہونے کا بین ثبوت ہے۔ یہی وہ ٹیکسالی اور چٹخارے والی زبان ہے جس سے دہلی والے پہچانے جاتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی اپنی تصانیف میں یہی زبان استعمال کرتے ہیں بلکہ انہیں ادبی لٹریچر میں اس زبان کا نقیب کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ شہابؔ دہلوی نے انہی کے انداز کی خوبصورت پیروی کی ہے۔ ان کی سوانح حیات ''وادی جمنا سے وادی ہاکڑہ تک'' میں اسی مخصوص لب و لہجے کا لطف اٹھایئے جس کے پہلو میں ایک وسیع اور بھرپور تہذیبی و معاشرتی پس منظر کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول

> ''شہاب تفصیل اور جزئیات کے شاعر نہیں ہیں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اختصار پسند اور اشاراتی انداز کے شیدا ہیں۔۔۔۔ ان کے ہاں دو قسم کے اثرات یکجا ہو گئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ دہلی کی زبان اور دہلوی شاعری کے نرم و لطیف لہجے سے متعلق ہیں اور دہلویت کا داخلی آہنگ بھی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے جس کی روایت اردو غزل میں میرؔ سے شروع ہوئی اور غالبؔ و ذوقؔ کے بعد تک چلتی رہی دوسری طرف وہ بہاول پور میں مدتوں رہائش کرنے کی وجہ سے ان مقامی اثرات سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ ملتانی اور بہاول پوری شعراء کے ہاں زبان کا وہ رچاؤ بھی موجود ہے جو شعراء دہلی کے ہاں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ احساسات کے نرم و نازک رشتے بھی دکھائی دیتے ہیں جن کا تعلق ان کی ذات اور گرد و پیش کے ماحول سے ہے۔ ادبی روایات کے مراکز سے دور رہنے کے سبب وہ شہرت جو ان کے کلام کی وجہ سے انہیں حاصل ہونی چاہیے تھی ابھی تک ان کے حصے میں نہیں آئی۔''(۶)

اردو شاعری میں تنقید حیات کے پہلو کو حالیؔ اور اقبالؔ نے خصوصی اہمیت دی۔ چنانچہ اردو شاعری میں وہ رجحانات عام ہوئے جنہیں جدت سے تعبیر کیا گیا۔ شعر کے معنوی امکانات میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اردو غزل اپنی روایتی ڈگر سے ہٹ کر بے شمار نت نئی پگڈنڈیوں پر چل پڑی۔ شہابؔ دہلوی کا تعلق اگرچہ روایتی شاعری کے مکتب فکر سے قائم ہوا لیکن انہوں نے اپنے فکری ارتقاء میں شاعری کو تنقید حیات سمجھنے کے رجحانات سے بھی اکتساب فیض کیا۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ کہتے ہیں کہ:۔

> ”رنگ تغزل جسے عشقیہ شاعری کا نام دیا جاسکتا ہے میرے شباب کی سرمستیوں کے دور کی یادگار ہے۔ مسائل حیات سے اگرچہ پہلے بھی سابقہ پڑتا رہا تھا لیکن زندگی کی جو تلخ حقیقتیں اب سامنے آئی ہیں۔ اور زمانے کے جن نشیب و فراز کا اب تجربہ ہوا اور مشاہدات و محسوسات، تصورات و توہمات پر غالب آگئے ہیں، آئینہ فکر میں خدوخال محبوب کے بجائے زندگی کی اُلجھی ہوئی زلفیں اور وقت کے کاکل پیچاں نظر آتے ہیں۔ یہی میرا موجودہ رنگ سخن ہے۔“(۷)

اب رہی شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کی بات تو اس سے مراد ایک طرف تو شاعر کا وہ شعور فن ہے جس کی بنیاد عالمگیر صداقتوں پر ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنی فکر اور ذہنی رویوں کو ایک ایسا خوبصورت قالب عطا کرتا ہے جو اس کی تخلیق کی تکمیل بھی کرتا ہے اور اسے جذب و کشش سے ہم کنار بھی۔ آپ چاہیں تو فنی شعور کے اس شاعرانہ اظہار کو اسلوب کی دلکشی اور لفظ و معنی کا خوبصورت آہنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی شہابؔ کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس تھا اور انہوں نے شعری تخلیق کے اس مرحلے میں بھی کمال مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے چنانچہ اپنے اس رجحان کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ

> ”ایک بات جس کا میں نے ہمیشہ خیال رکھا ہے وہ شعر کی زبان اور شعر کے دوسرے لوازم ہیں۔ ان میں تشبیہ و استعارہ کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں نیز تفصیل کی بجائے اجمال کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک غزل میں خواہ کیسے ہی سیاسی یا سماجی مسائل بیان کئے جائیں انہیں غزل کے ماحول سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔“(۸)

احسان دانش فرماتے ہیں۔

> ”جہاں تک شہابؔ دہلوی کے نظم و نثر لکھنے کا تعلق ہے۔ وہ قلم اور اسلوب بیان کے صاحب طرز لوگوں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری بے مقصد نہیں بلکہ ان کے یہاں زندگی اور اس کے مختلف گوشوں کی ایسی ترجمانی ملتی ہے کہ میں نے ان کے مخالفوں کو بھی ان کے اشعار کا مداح پایا ہے۔ اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار جدید رنگ سے

ہٹ کر اس قدیم روش سے کرتے ہیں جو عوام کے کام کی ہے۔ ان کے یہاں ابہام نہیں ہے
بلکہ سادگی و پرکاری والی بات ہے۔"(۹)

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی نئے مضمون یا خیال کی پیشکش ہی تخلیق کے ضمن میں آتی ہے۔ لیکن اگر تخلیقی عمل کی ہمہ گیری اور بوقلمونی کو پیش نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اسلوب کا نیا پن بھی تخلیق کے زمرے میں آتا ہے۔ کیونکہ یہ بات کہنے کا سلیقہ ہی تو ہے جو بات میں زور اثر پیدا کرتا ہے یا زور اثر سے محروم کر دیتا ہے۔ ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے شہابؔ کو اسلوب اور انداز اظہار پر جو حاکمانہ قدرت حاصل ہے وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ اسلوب کی اثر آفرینی کے حوالے سے اگر شعری ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تخلیقی اعتبار سے مضمون یا نئے خیال کی جو اہمیت ہے، اس سے کہیں زیادہ اہم حیثیت اسلوب کو حاصل ہے۔ اردو شاعری میں اکثر و بیشتر الفاظ اور اصطلاحات غزل کے مزاج سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر شمع و گل، سحر، ظلمت، بہار، خزاں ایسے الفاظ ہیں جو تشبیہ و استعارہ کے حوالے سے اشعار کی زینت بنتے رہے ہیں۔ شمع کو حسن محبوب سے نسبت دینا ایک قدیم روایت چلی آتی ہے۔ لیکن اس روایت کو جب شاعر ایک مخصوص اسلوب عطا کرتا ہے تو باوجود اس کے کہ بنیادی خیال ایک ہی ہوتا ہے۔ اسلوب کے الگ الگ ہونے کے باعث زور اثر میں فرق آتا چلا جاتا ہے۔ شہابؔ دہلوی کی شاعری کو ان کے مخصوص اسلوب اور انداز بیان کے حوالے سے پرکھا جا سکتا ہے۔

دبستان بہاول پور ایک مصنف ماجد قریشی شہابؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شہابؔ کے ہاں قدیم اساتذہ کی طرح مشکل اور سنگلاخ زمینیں، ردیف، قافیہ کا فنکارانہ استعمال اور فنِ شعر کا رکھ رکھاؤ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے مگر اس کے باوجود قدیم اساتذہ کی طرح لکیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ شاعری کے میدان میں ندرت خیال تنوع اور نئے تجربات کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ نے قدیم روایات میں نئی روح پھونکی ہے اور صرف لکیر کے فقیر ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ قدیم سانچوں میں بھی ڈھالا ہے۔"(۱۰)

اپنے تصور شعر کے بارے میں شہابؔ دہلوی لکھتے ہیں۔

"شعر کے متعلق میرے معتقدات یہ ہیں کہ یہ احساس لطیف کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ میرے خیال کے مطابق زندگی کے مختلف محرکات ادب کی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں اور اسے ایک ارتقاء پذیر معاشرے کا ساتھ دینا چاہئے۔ لیکن صرف اسی حد تک کہ ہماری ادبی روایات اور قومی اقدار اس سے متاثر نہ ہوں۔ میں بلندی اور مضمون آفرینی کو

شعر کی جان سمجھتا ہوں لیکن زبان و محاورہ کا خون کر کے کسی اعلیٰ مضمون کو شعر میں سمونا
میرے نزدیک ادبی کفر ہے۔"(۱۱)

اگر یہ کہا جائے کہ مرثیے سے بڑھ کر مزاحمتی ادب کوئی اور نہیں تو یہ نہ تو مجہول دعویٰ ہے اور نہ مبالغے کا کمال۔ آج مزاحمتی ادب کا بڑا چرچا ہے۔ اس کی ادبی قدر و قیمت کے حوالے سے نت نئے مباحث سامنے آتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی کچھ عرصے سے مزاحمتی ادب کے نام پر تحقیق و تنقید دونوں ہی پڑھنے کو مل رہی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں مزاحمتی ادب مرثیے کی شکل میں صدیوں سے موجود ہے۔ مرثیے کی صنف یوں تو واقعہ کربلا سے منسلک ہے اور بادی النظر میں اس صنف کے ذریعے ماضی کا واقعہ ہی سامنے آتا ہے لیکن حقیقتاً ماضی کے حوالے سے یہ ہر ظلم اور ہر یزیدیت کے خلاف موثر ترین آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرثیے کی صنف کرب و بلا کی کیفیات کا بیان اور عظیم شہداء سے عقیدتوں کا اظہار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کو جور و جبر سے آزاد کرانے کی خلاقانہ کاوش بھی ہے۔ جو ہوتی رہی ہے، اور ہوتی رہے گی۔ اردو میں یہ صنف فارسی سے آئی۔ فارسی ادب میں یہ روایت بڑی مستحکم تھی کہ ہر شاعر بلا تخصیص مسلک مرثیہ کہتا تھا اور شہدائے کربلا کے حضور اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کرتا تھا۔ اردو میں اولاً دکنی شعراء نے بعد اُشعراء شمالی ہند نے یہ روایت اپنائی۔ وہ حمد و نعت کے ساتھ ساتھ شہداء کی منقبت کہتے رہے۔ قصائد میں اکثر اور مراثی میں ہمیشہ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول کے ساتھ منقبت لکھی جاتی رہیں۔ غالبؔ و سوداؔ کے قصائد اور ان کے مراثی، خلیقؔ، ضمیرؔ، میر نفیسؔ، مرزا دبیرؔ کے مرثیے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول کے ساتھ منقبت اہل بیت اطہار سے پُر ہیں۔ اس کے بعد میر نفیسؔ، پیارے صاحب رشیدؔ اور مرزا اوجؔ نے اپنے مراثی میں مدح اہل بیت کا حق ادا کیا۔ علاوہ ازیں جوشؔ ملیح آبادی، آل رضاؔ، نسیمؔ امروہوی، نجمؔ آفندی، جمیلؔ اظہری، آغا سکندر مہدی اور ڈاکٹر صفدر حسین نے بھی مرثیے کہے۔ اکثر و بیشتر کیا بلکہ تقریباً سب کے سب مرثیہ گو حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے آغاز کر کے منقبت اہل بیت اطہار کہتے رہے۔ مفکر اسلام حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی جہاں سیدنا حضرت محمد ﷺ کی مداحی میں انتہائی گہری عقیدت اور بے پناہ خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے وہاں اہل بیت اور شہدائے کربلا کی مدح میں اسی بے پایاں عقیدت، گہرے خلوص اور پُر جوش محبت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

الحاصل فارسی اور اردو کے تمام باکمال شعراء نے اہل بیت اطہار پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ چونکہ سید مسعود الحسن دہلوی بھی ایک عظیم شاعر تھے لہٰذا انہوں نے بھی حمد، نعت، سلام، قصیدہ اور مرثیے کے سیکڑوں اشعار لکھ کر اہل بیت اطہار کے لیے اپنی بے پناہ عقیدت، اپنے انتہائی خلوص محبت کا ثبوت دیا ہے۔

شہابؔ دہلوی کا خصوصی کلام مشتمل بہ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول، سلام رسول و حسین، قصائد مصطفی ﷺ اور مراثی علی و حسینؓ، زبورِ طباعت سے آراستہ ہو کر "موج نور" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا یہ مجموعہ کلام اگرچہ ضخیم نہیں ہے تاہم معیاری، استادانہ، بلند قدر اور گراں مایہ ہے۔ ان کی منقبتوں اور مرثیوں کے تو بعض مصرعے بھی ایسے ہیں جو کہ آئندہ ضرب المثال کی حیثیت سے مشہور ہوں گے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

ع پانی پہ جنگ ہو یہ کہاں کا اصول ہے(۱۲)

ع خارج لغت سے کر دیا ڈر کو حسین نے (۱۳)

ع ہاشم کے گھر کی لڑکیاں ہمت میں کم نہیں(۱۴)

ع حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کے لیے (۱۵)

شہاب دہلوی نے اپنے مراثی میں اسی روایتی اثر انگیزی اور زور بیان کو برقرار رکھا جو مرثیے کے خدوخال کا حصہ ہیں، اسی سے مرثیہ سننے یا پڑھنے والا روحانی طور پر کرب وبلا کی کیفیات اپنے آپ پر محسوس کرنے لگتا ہے اور آنکھوں سے آنسو اور جسم سے روح نکلنے لگتی ہے۔

لاشے پڑے تھے سامنے صحرا تھا لالہ گوں
حد نگاہ تک نظر آتا تھا خوں ہی خوں
ماحول پر تھا چھایا ہوا موت کا فسوں
حیران ہو کے دیکھتا تھا چرخ بے ستوں

(۱۶)

جس وقت سوئے گنج شہیداں نظر گئی
سیدانیوں کے دل پہ قیامت گزر گئی
مشکل تھا ضبط مرحلہ صبر سخت تھا
دل داغ داغ اور جگر لخت لخت تھا
ہر شاخ سر بریدہ، قلم ہر درخت تھا
زد پر خزاں کی گلشن زہرا کا بخت تھا
دل کو سنبھالا آہ کے شعلے نکل پڑے
روکی جو آہ آنکھ سے چشمے اُبل پڑے

(۱۷)

شہابؔ دہلوی کے مرثیے ہیئت، انداز اور موضوع کی پیش کش کے اعتبار سے مکمل طور پر روایت سے وابستہ ہیں۔ یہ مرثیے کی روایت کو آگے تو نہیں بڑھارہے البتہ روح عصر کو اپنے بیان سے ہم آہنگ کرکے اس روایت کو استحکام ضرور بخش رہے ہیں۔ شہابؔ کے مرثیوں میں جہاں رفقائے حسین کی مشکلات اور فوجِ شام کی ستم آرائی کا پُر سوز تذکرہ ہے، وہاں دورِ حاضر کے عذابوں اور ظالموں کی شقاوتوں کا بیان بھی ہے۔ جبھی تو وہ پھر کسی حیدرؓ کرار، پھر کسی عباس علمدارؓ اور پھر کسی حسینؓ عالی مقام کے منتظر ہیں۔

گونگے بھی ہیں بہرے بھی ہیں پتھر کی طرح
دل بند ہیں ان کے در خیبر کی طرح
ہے اب بھی شقاوت کا اثر لوگوں پر
آئے پھر کوئی حیدر صفدر کی طرح

(۱۸)

کربلا کے اشعار میں آج کا نقشہ کیا خوب بیان کیا ہے۔

دھارے ہوئے ہیں روپ سب ابن زیاد کا
آنکھوں میں ہر کسی کے ہے اب شمر کی نظر
انداز شامیوں کے سے ہیں اہل در کے
ڈھانپے ہوئے ہے شرم سے منہ بانوئے سحر
ہر شہر اس جہاں کا ہے کوفہ بنا ہوا
ہر سمت ہے کھلا ہوا مکر و ریا کا در

(۱۹)

شہابؔ دہلوی کے مرثیے میں صرف آنسو نہیں ہیں بلکہ دعوتِ عمل بھی ہے۔ حسینیتؓ کو زندہ کرنے کی تاکید بھی ہے اور حق کی خاطر قربانی کا جذبہ بھی ہے۔

جذبہ حسینیتؓ کی ضرورت ہے آج بھی

درکار پاسبانی اُمت کو پھر ہیں سر
نوحہ گری کا اور نہ ماتم کا وقت ہے
حالات سے نمٹنے کی اے دوست فکر کر

(۲۰)

عام مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ آج کے مسلمان نے تمام معاملات کو صرف رسم بنالیا ہے۔ ایسی رسم جو اصل میں روح سے عاری ہے۔ عیدالاضحی پر جانور کی قربانی تو کی جاتی ہے لیکن اس کے درس سے ہماری زندگیاں اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ عبادت کی جاتی ہے لیکن عام زندگی پر عبادت کے اثرات ناپید ہیں۔ اسی طرح غم حسینؓ بھی منایا جاتا ہے لیکن امامؑ عالی مقام کی قربانی سے ہم اپنے باطن میں وہ آگ نہیں سُلگا پاتے جس کے بغیر مرگ یزید اور حیات اسلام ممکن نہیں۔

ادھر یہ غیرت دیں، خون میں نہائے حسینؓ
ادھر یہ حال زبوں لب پہ صرف ہائے حسینؓ
حسینیت کے مشن کو بھی رکھیں زندہ
یہ کیا کہ اشک بہاتے رہے برائے حسینؓ
شہاب ذوق عمل کی فقط ضرورت ہے
جبینِ دہر پہ روشن ہیں نقش پائے حسینؓ

(۲۱)

مسدس کی صورت میں چوہتر بندوں پر ایک طویل مرثیہ آپ کے کمال فن کی دلیل ہے۔ مرثیہ میں تسلسل کامل پایا جاتا ہے۔ مسدس کے بند تدریجی تسلسل کے ساتھ مربوط ہیں۔ مرثیے کے فنی تقاضوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مرثیے کے اجزاء قائم کرنے میں میر انیسؔ کا تتبع کیا گیا ہے۔ خدائے سخن میر انیسؔ نے اپنے ایک مرثیے میں شاعری کا مندرجہ ذیل معیار مقرر کیا تھا۔

روزمرہ شرفا کا ہو، سلامت ہو وہی
لب و لہجہ ہو وہی، اور قناعت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی

جد و آبا کے سوا، اور کسی کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو
ہے کجی عجیب، مگر حسن ہے، ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے، مگر نیک ہے، گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے، فقط نرگس جادو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ، چہرہ گل رو کے لیے
داند آن کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع، و دہر نکتہ مقامے، دارد

(۲۲)

حضرت امام حسینؓ کے زیر نظر مرثیے میں انیسؔ کے مقرر کردہ معیار کا خصوصی طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ مرثیے میں حمد باری تعالیٰ، حضرت امام حسینؓ کا سراپا، ان کی مدحت، فوجِ شام کے مقابلے میں صف آرائی، واقعاتِ جنگ، مخدراتِ عصمت کی بے چینی اور اضطراب، حضرت عباسؓ، قاسمؓ، اکبرؓ اور اصغرؓ کی شہادتیں، حضرت امام حسینؓ کی میدانِ کارزار میں تشریف آوری، ان کا رجز، گھوڑے کی تعریف، سخت معرکہ آرائی کے بعد شہادت اور آخر میں ماتم یا بین کا پُر تاثیر اختتامی شعر۔ الغرض مرثیہ ان تمام فنی خوبیوں سے مزین ہے جو مرثیہ گو اساتذہ کے نزدیک لابدی اور مسلم ہیں۔

اس مرثیے میں حمد باری تعالیٰ کے بعد امام حسینؓ کا سراپا اور مدحت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

قرآں کا وصف، نو رموز لیے ہوئے
ایماں کا حسن مازلف مبصر لیے ہوئے
آنکھیں، شراب نور کے ساغر لیے ہوئے
صورت تمام، عکس پیمبر لیے ہوئے

(۲۳)

فرق نیا زخم ہو برائے سجود
آئے جو لب پہ نام، تو آئے درود بھی
عظمت وہی، کمال وہی، برتری وہی
قوت وہی جلال وہی، رہبری وہی
احمدؐ، علیؓ، حسینؓ، کہو بات ایک ہے
شکلیں الگ الگ ہیں مگر ذات ایک ہے

(۲۴)

معرکہ آرائی کے لئے صف بندی کا نقشہ لاجواب ملاحظہ ہو۔

اسی سمت ٹڈی دل کی طرح فوج ملک شام
اس سمت چند لوگ دل آرا و خوش خرام
سامان جنگ ان کی طرف نک سے سک تمام
تقویٰ و زہد ان کی طرف اور خدا کا نام
کثرت ادھر خلوص ادھر اتقا ادھر
دولت ادھر سخاوت و مہر و وفا ادھر

(۲۵)

بعد از قتل وغارت میدان کارزار کی صورت اس طرح سامنے آئی۔

ہاتھوں سے دل کو تھامے کھڑے تھے شہ زمنؒ
لاشے پڑے تھے سامنے بے گورو بے کفن
تھے تر بتر لہو میں گل و لالہ و سمن

باایں ہمہ، لبوں پہ جو آیا، تو یہ سخن
خوش ہوں کے حق، حفاظت دیں کا ادا ہوا
ہر قطرہ ان کے خوں کا قبول خدا ہوا

(۲۶)

حضرت امام حسینؓ کا دشمن کے سامنے اتمام حجت دیکھئے۔

بیٹا ہوں میں علی کا، نواسہ نبیؐ کا ہوں
زہراؓ کا لال ہوں، چہیتا نبیؐ کا ہوں
دلبر نبیؐ کا ہوں، میں دل آراء نبیؐ کا ہوں
آنکھوں کا ہوں قرار، اُجالا نبیؐ کا ہوں
ہمراہ لے کے جاؤ گے، دنیا کو حشر میں
کیا منہ دکھاؤ گے، مرے نانا کو حشر میں

(۲۷)

تشبیہات کی جدت اور پیش کش کا انداز مرثیے کو خوب تر بنا رہا ہے۔ امام عالی مقام کی تلوار کی تعریف میں کہتے ہیں۔

اتنی مہین کہ باریک بال سے
پرواز اتنی تیز کہ بڑھ کر خیال سے
چاق اس قدر جواب دے پہلے سوال سے
ایسی حسیں کہ سمجھی نہ جائے مثال سے

(۲۸)

درحقیقت سید شہابؔ دہلوی کا یہ مرثیہ، کمال فن کے اعتبار سے اساتذۂ فن، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مراثی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مرثیے کے جملہ اجزاء فن مرثیہ گوئی کے تمام فنی تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرتے ہیں۔ سیدنا حضرت امام حسینؓ کا سراپا، ان کی معرکہ آرائی کے

لیے صف بندی، مقاصد کے تصادم کا بیان، اقرباء کی شہادت، میدانِ کارزار کی منظر کشی، آپ کا اتمام حجت کرنا، گرمی کی شدت کا بیان، آپ کے راہوار کی تصویر کشی، تلوار کا بیان اور آخر میں آپؓ کی شہادت کا دل گداز بیان، سب کے سب فصاحت و بلاغت اور فن کے اعتبار سے لاجواب اور مثالی ہیں۔ شہابؔ دہلوی کا یہ مرثیہ اعتبار فن فارسی اور اردو مرثیہ نگار اساتذہ کے مراثی کا لہجہ جہت ہم پلہ ہے۔ مرثیہ کے درج ذیل اشعار تو اپنی مثال آپ ہی ہیں۔

دیں کی سپر ہے، دیں کی اماں، دیں پناہ ہے
یعنی بنائے فلسفہ لا الٰہ ہے (۲۹)

رنگ علیؓ بھی اس میں ہے، رنگ بتول بھی
ہے ختم اس پہ، رونق باغ رسول بھی
احمدؐ علیؓ، حسینؓ کہو بات ایک ہے
شکلیں الگ الگ ہیں مگر ذات ایک ہے
(۳۰)

برق، تپان کی لہر، جلال فدا کی رو
میدان میں قدم بقدم تھی، فضا کی رو
نشہ شراب تند کا ایسا سوار تھا
اعداء کا خوں گرم ہی جس کا اتار تھا
(۳۱)

سورج سے تو تمتما کے، زمین لال ہو گئی
ریگ رواں، جہنم سیال ہو گئی

(۳۲)

ہر گوشہ بساط، تباہی میں آگیا
سورج گہن میں، چاند سیاہی میں آگیا (۳۳)

حقیقت تو یہ ہے کہ شہابؔ دہلوی کے قصائد ہوں یا مراثی ادب عالیہ کا حصہ ہیں۔ آپ کے کلام میں حسن بیان، جوش و خروش، تشبیہات، استعارات، مجاز مرسل اور تلمیحات کے ساتھ تراکیب الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ آپ نے جہاں عام تراکیب کا استعمال کیا ہے وہاں نت نئی اور نادر و کمیاب تراکیب بھی تراشی ہیں۔

"مشتے از خروارے" چند نادر تراکیب ملاحظہ ہوں جن کا استعمال آپ جیسے باکمال استاد ہی کا حصہ ہے۔

روحِ بہارِ چمن، قلعۂ فکر، ہم نفسِ رحمت کل، آئینہ دار حسنِ بیان، ترجمانِ قلبِ سخن، سرشتہ روزِ عید، روکش عیش جدید، شمع بزم ہدیٰ، باغ حسنِ شریعت، موجِ غرور، زیست ساماں، تیرگیٔ خیالات، بہارِ وجود، نوائے سحر، صبحِ زیست، جہنم سیال، دہانِ زخم، تلاطم آفات، بہارِ بہشت، پیمبر سکوں، جبیں دہر، آب ذوالفقار، دیو ستم، یہ تراکیب بلاشبہ تراش خراش کے اعتبار سے نادر ہیں اور اپنے خالق کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہیں۔

الحاصل سید مسعود الحسن شہابؔ دہلوی کے کلام کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اس حقیقت امر پر شاہد عادل ہے کہ موصوف بلاشبہ اردو ادب کے اساتذہ شعراء کی صف اول میں بلند و بالا اور نمایاں مقام پر فائز ہیں۔ آپ کی نغز گوئی مسلم ہے۔ طوالت مضمون سے اجتناب کرتے ہوئے راقم الحروف اپنے اس کام کو جناب شہابؔ کی ارشاد کردہ ایک رباعی اور ان کے کلام کے ایک بند مسدس پر پایۂ اختتام پہنچاتے ہوئے یہ دعا گو ہے کہ باری تعالیٰ جناب شہابؔ دہلوی کو اہل بیت اطہار سے ان کی بے پایاں عقیدت اور والہانہ محبت کا اجر عطا فرمائے (آمین) آخر میں مدحت اہل بیت پر شہابؔ دہلوی کا فخر اور انبساط دیکھئے۔

دل دولت و ثروت سے غنی ہو جائے
بیگانہ دنیائے دنی ہو جائے
مل جائے غم ہر دو جہاں سے فرصت
ہر شخص اگر پنجتنی ہو جائے (۳۴)

مداح اہل بیت ہوں، خادم انھی کا ہوں
دیوانۂ خدا ہوں، میں شیدا نبی کا ہوں
میں مدعی نہ دہر میں، کیوں برتری کا ہوں
آخر تو فرد نہیں بھی گروہ علی کا ہوں
میں شاہ دیں کے در کا گدا ہوں یہ ناز ہے
کچھ عرش سے بھی اونچی، جبینِ نیاز ہے

(۳۵)

حوالہ جات

۱۔ شبلی نعمانی: موازنہ انیس و دبیر، (کراچی: مطبوعہ اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء)، ص ۷
۲۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی؛ مرتب: جہانِ تخلیق کا شہاب، (بہاول پور: شہاب دہلوی اکیڈمی، ۲۰۰۶ء)، ص ۷
۳۔ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۲ء، ص ۶۹
۴۔ ایضاً، ص ۶۹
۵۔ شہابؔ دہلوی: گل و سنگ، (مقام: ندارد، س ن)، ص ندارد
۶۔ مشمولہ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۲ء، ص ۶۳
۷۔ ایضاً، ص ۶۵
۸۔ ایضاً، ص ۶۵۔۶۶
۹۔ ایضاً، ص ۶۹
۱۰۔ ماجد قریشی: دبستان بہاول پور، (بہاول پور: ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۲۰
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۹
۱۲۔ شہابؔ دہلوی: موج نور، (بہاول پور: مکتبہ الہام، مطبوعہ ندارد، س ن)، ص ۱۲۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۸۹
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۱
۱۵۔ ایضاً، ص ۸۷
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔۱۸۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۹

۲۱۔ مشمولہ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۱۔ ۱۱۴

۲۲۔ شہابؔ دہلوی: موج نور، ص ۱۵۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۳۰۔ مشمولہ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۴

۳۱۔ شہابؔ دہلوی: موج نور، ص ۱۸۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

ماخذات

شبلی نعمانی: موازنہ انیس و دبیر، کراچی: مطبوعہ اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

شہابؔ دہلوی: گل و سنگ، مقام: ندارد، س ن

شہابؔ دہلوی: موج نور، بہاول پور: مکتبہ الہام، مطبوعہ ندارد، س ن

طاہر تونسوی، ڈاکٹر؛ مرتب: جہانِ تخلیق کا شہاب، بہاول پور: شہاب دہلوی اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

ماجد قریشی: دبستان بہاول پور، بہاول پور: ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق، ۱۹۹۴ء

مشمولہ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۲ء

مشمولہ "الزبیر" سہ ماہی، شہاب دہلوی نمبر، ۱۹۹۴ء